تبصرہ و تعارف

رحمت تمام

شاعر: ڈاکٹر تابش مہدی

صفحات: ۱۷۶

ناشر: ادارہ ادبیات عالیہ، بیت الراضیہ G-5/A، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

ڈاکٹر تابش مہدی کا شمار عصر حاضر کے ممتاز نعت گو شعرا میں ہوتا ہے۔ 'رحمت تمام' ان کا پانچواں نعتیہ مجموعہ ہے۔ اس سے قبل اُن کے نعتیہ مجموعے لمعات حرم، سلسبیل، صبح صادق اور طوبیٰ کے نام سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ جب کہ ایک مناقب کا مجموعہ نجوم ہدایت بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہ تمام مجموعے نعتیہ شاعری کے تناظر میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ نعت و منقبت کے علاوہ ڈاکٹر تابش مہدی کی غزلوں کے بھی پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ زیر تبصرہ نعتیہ مجموعۂ کلام ''رحمت تمام'' میں حمد و مناجات، نعت رسول اور مناقب شامل ہیں۔

اردو میں نعت گوئی کی روایت بہت قدیم ہے۔ ہر عہد میں شعرا نے نعتیہ ادب کو فروغ دیا ہے۔ البتہ عقیدت و محبت میں ہمارے بہت سے شعرا نے غلو سے کام لیا۔ عہد کو معبود سے اور مدینے کو کعبے سے برتر دکھانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر تابش مہدی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نعتیہ ادب، خصوصاً نعتیہ شاعری کو جہاں دعوت و تبلیغ کا ذریعہ بنایا، وہیں اپنی نعتوں کو محبت رسول پیدا کرنے کے لیے وسیلے کے طور پر بھی استعمال کیا۔ عقیدت و محبت کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں، جن میں آپ ﷺ کی کسی نہ کسی تعلیم کو شعری پیکر میں ڈھالا گیا ہے، تاکہ سیرت رسول کے توسط سے لوگوں میں اسلام کی اصل تعلیمات عام ہوں۔

ڈاکٹر تابش مہدی کے نعتیہ کلام میں مدینہ منورہ سے جو جذباتی وابستگی ہے، وہ قابل رشک ہے۔ مدینہ کے لیے بے قراری اور اضطراب کی کیفیت ان کے اشعار میں بہت نمایاں ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی جیسے عظیم سخن شناس نے آپ کو زائر حرم ثانی کے لقب سے سرفراز کیا ہے۔ ان کے پانچوں مجموعوں سے اگر صرف ان اشعار کو جمع کیا جائے جس میں ذکر مدینہ ہو تو ایک ضخیم مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ یہی کیفیت رحمت تمام میں بھی پوری طرح پائی جاتی ہے۔ اس نعتیہ مجموعۂ کلام میں ہم خود کو ایک ایسی فضا سے قریب پاتے ہیں، جس میں اسوۂ محمدؐ کا تذکرہ ہے، اس کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنے کی تڑپ ہے اور شہر نبی یعنی مدینہ منورہ اور آپ کے روضہ کو بار بار دیکھنے کی خواہش اور وہیں رہ جانے کی آرزوؤں کا ایک بے کراں سیلاب ہے:

جاہ و منصب اور نہ کوئی مرتبہ درکار ہے
ہم غلاموں کو مدینے کی ہوا درکار ہے

اے بادِ صبا جانب بطحا مجھے لے چل
برداشت نہیں فرقت سلطان مدینہ

ڈاکٹر تابش مہدی اپنی نعتوں میں خلفائے راشدین کا ذکر بھی بہت والہانہ انداز میں کرتے ہیں۔ یہ التزام بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی نے اسی لیے اُن کی نعتوں کے بارے میں لکھا تھا کہ ''آپ نے مقام نبوت و رسالت کی حدود میں رہ کر آپ ﷺ کی اور آپ کے قدسی صفات جانشینان کرام کی تعریف و توصیف کا کامل حق ادا کیا ہے۔'' ان اشعار سے مولانا قاسمی کی اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے:

ابوبکر و عمر، عثمان و حیدر کا فدائی ہوں
اسی باعث سخن گوئی ہے میری نعت اچھی ہے

اصحاب نبی سارے ہدایت کے ہیں تارے
دھبا کسی خاتم کے نگینے میں نہیں ہے

تابش مہدی کی شاعری کا عمومی انداز بہت سادہ اور سہل ہونے کے ساتھ ساتھ کیفیت سے بھرپور ہے۔ اس اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے بہت درست بات ارشاد فرمائی ہے کہ ''تابش مہدی کے کلام میں سادہ حقیقت کو رعنائیِ خیال عطا کرنے کی صفت ہے۔ الفاظ سادہ لیکن پر اثر اور اظہار خیال حقیقت پسندانہ لیکن حسن ادا کا حامل ملتا ہے۔'' یہاں پر چند اشعار بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

چلو نقش قدم پر مصطفیٰ کے
یہی ہے اصل میں جینے کا جینا

اعزہ اقربا مادر پدر سب آپ پر قرباں
دل مومن محمد مصطفیٰ کی راجدھانی

حقیقت یہ ہے کہ ''رحمت تمام'' کے توسط سے ڈاکٹر تابش مہدی نے نعتیہ ادب کے نگار خانے میں ایک اہم دستاویز پیش کی ہے۔ اس مجموعے میں حمد و مناجات سے جو سلسلہ شروع ہوتا ہے، وہ نعت رسول سے ہوتا ہوا منقبت پر منتج ہوتا ہے۔ اس کے مطالعے سے ہم پر یہ واضح ہوتا ہے کہ تقدیسی شاعری کے آداب کیا ہیں؟ نعت میں کن کن امور کا لحاظ کرنا ہے؟ اور مدح صحابہؓ میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ چونکہ ایک لمبے عرصے سے نعتیہ مشاعروں کے ساتھ ساتھ مدح صحابہؓ کے جلسوں میں بھی شریک ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر تابش مہدی بہ جا طور پر شعرء امدح

صحابہؓ کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں، اس لیے انھیں مدح صحابہؓ کی فکری اور فنّی باریکیوں سے خوب واقفیت ہے۔ہم رحمت تمام کے ذریعہ رسول اکرم ﷺ کی سیرت و پیغام کے ساتھ ساتھ عظمت صحابہؓ سے بھی واقف ہوتے ہیں۔

آج امت مسلمہ کو جس طرح کی فکری یلغار کا سامنا ہے اور جس میں بڑے بڑوں کے قدم بہک رہے ہیں، ڈاکٹر تابش مہدی نے اپنی نعتیہ شاعری کے ذریعہ اس فکری یلغار کے تمام پہلوؤں کو واضح کیا ہے اور اس کا سامنا کرنے کا بہترین علاج بھی تجویز کیا ہے۔اس لیے یہ بات حتمی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ادبی حلقوں میں ''رحمت تمام'' کا استقبال کیا جائے گا اور اسے اردو کے نعتیہ ذخیرے میں ایک سنگ میل کی حیثیت سے دیکھا جائے گا۔

تبصرہ نگار: ڈاکٹر عمیر منظر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس (یوپی)

بوند سمندر (غزلیات)

مصنف: اسلم بدر

صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۲۰۰/روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

اسلم بدر اردو کی غزلیہ شاعری کا جانا پہچانا نام ہے۔جھارکھنڈ میں جن شعرا نے اپنی خاص طرز نوا ایجاد کی ہے، ان میں صدیق مجیبی، پرکاش فکری، وہاب دانش، رونق شہری، خورشید طلب، اسلم بدر اور شان بھارتی کا ذکر آتا ہے، مگر اسلم بدر صرف شاعر نہیں، منفرد لب ولہجہ اور ایک خاص طرز ادا کے حامل غزل گو شاعر ہیں، کچھ لوگوں نے جھارکھنڈ میں اردو غزل کی جو خود ساختہ تثلیث تیار کی ہے، اس میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے، یہ بات چنداں قابل تعجب وحیرت نہیں کہ تنقید، تعصب وتحفظ کی آلائش سے پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی اور اردو غزل کی تثلیث ہی کیوں، ترتیع، تخمیس اور تسدیس بھی تو تیار کی جاسکتی ہے۔انصاف کی بات یہ ہے کہ اسلم بدر نے اپنی غزلیہ شاعری سے معاصر تخلیقی منظرنامے میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔اسلم بدر فلسفہ کے حامی شاعر ہیں اور اپنی غزلوں میں فلسفیانہ مضامین کی آنچ دینے میں کام یاب وکامران بھی رہے ہیں۔اپنی تلاش وجستجو کی فطرت کے سبب کائنات وموجودات کی علت کو جاننے اور اس کے پوشیدہ اسرار ورموز کی افہام وتفہیم کی وادی میں سرکھپاتے رہتے ہیں۔وحدت الوجود اور صوفیانہ مضامین ان کی شاعری کا شناخت نامہ بن گئے ہیں، کائنات سے ذات تک اور مخلوق شناسی سے خالق تک رسائی کا سفر ان کی شاعری کا حاوی عنصر ہے۔

بوند سمندر میں کل ۱۲۹/غزلیں ہیں اور اخیر میں غزل کائنات کے عنوان کے تحت پنج موضوعی غزل شامل ہے، جس میں رنگ، نغمہ، پیکر، رقص اور خوشبو کے ذیلی عناوین کے تحت الگ الگ غزل لکھی گئی ہے۔یہ ان کی ہفت رنگ دنیائے غزل کا ایک دوسرا رنگ ہے، جس میں انہی الفاظ کو ردیف کے طور پر استعمال کرتے ہوئے فن غزل گوئی میں مشکل ردیف کے استعمال کے ہنر کو آشکار کیا گیا ہے۔

ہر شاعر کا خاص نظریہ شاعری ہوتا ہے، انھوں نے اپنے شعری نقطۂ نظر کا اظہار غالب کے اس مصرع سے کردیا ہے کہ دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر اور پھر خود بھی تو ایک غزل میں یہ کہا ہے:

کبھی تو شعر کا کہنا لگا ہے کار ثواب
کبھی نزول کا عالم عذاب سا کچھ تھا

اس مجموعہ میں شامل غزلوں میں، اسلم بدر کی شاعری کا جو بنیادی اور اساسی مزاج یعنی خلوت سے جلوت اور کائنات سے پس کائنات تک کی سیر ہے، وہ کھل کر نمایاں ہوا ہے۔وحدت الوجود کا فلسفہ صدائے بازگشت کے طور پر غزلوں کے حجاب سے جھانکتا ہے۔صوفیانہ مضامین میں خشکی نہیں، بلکہ تخلیقی پیکر میں غزلیہ چاشنی کے حامل ہیں۔کلاسیکی رچاؤ انفرادی عصری تجربات سے بغل گیر ہے۔اسلم بدر نے جس طرح ایک کلاسیکی مضمون فلسفۂ وحدت الوجود کو اپنی شاعری کا محور ومرکز بنایا ہے، اسی طرح انھوں نے اس قدیم کلاسیکی موضوع کی مناسبت سے زبان اور الفاظ بھی کلاسیکی استعمال کی ہے، تاکہ یہ ادق اور اہم مضمون اسی پیرہن میں سامنے آسکے جو کلاسیکی شعرا کا مزاج ومنہاج رہا تھا۔گرچہ اس میں مبالغہ کی آرائش ہے، مگر احمد بدر کی اس بات سے ہمیں اتفاق کرنا پڑے گا:

''مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ غالبؔ، اصغرؔ گونڈوی اور عبدالعلیم آسیؔ کے بعد تصوف کے موضوعات، بالخصوص وحدۃ الوجود کا ایسا شاعرانہ رچاؤ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔''

زیرنگاہ غزلیہ مجموعہ میں بھی ایسے اشعار کی کثرت ہے، جو وحدۃ الوجود کے فلسفہ پر مرتکز ہیں، مگر جیسا کہ غزل کا اپنا مزاج ہے کہ وہ سات زمین اور سات آسمان اور ثریٰ سے ثریا تک بے پناہ وسعتوں کی حامل صنف سخن ہے کہ اس کو کسی خاص مطلب ومعنی کے دائرے میں محدود ومقید نہیں کیا جاسکتا۔اسی طرح ان غزلوں کو بھی بظاہر صوفیانہ اور فلسفیانہ وحدۃ الوجود کے مضامین کے گرد طواف کرتی ہوئی کہا جاسکتا ہے، مگر جب اس کو وسعت ورفعت کا لباس عطا کیا جائے تو پھر اس کی تشریح کا جہان بھی کسی سرحد کے اندر قید نہیں رہ سکتا۔

دیکھیے یہ چند اشعار، اگر ان کے فلسفۂ شاعری کو نظر میں رکھیں تو وہی شکایت زبان پر آئے گی کہ بقدر شوق نہیں ظرف تنگ نائے غزل اور اگر اس سے اوپر اٹھ کر بات کی جائے گی تو پھر یہ لامحدود وسعتوں کے حامل اشعار کہلائیں گے:

میں تنہا کیا کیا دیکھوں، کیسے دیکھوں
ایک ہی جلوہ، منظر منظر کافی ہے

جب تک ٹوٹ نہ جائیں دل کی دیواریں
دیواروں میں چھوٹا سا در کافی ہے
میں نمائش میں بھی رہتا ہوں، سر بازار بھی
کوزہ گر کے ہاتھ کا کوزہ بھی ہوں شہکار بھی

اسلم بدر نے عربی فارسی کی روایت سے مضامین وموضوعات اخذ کیے ہیں، مگر ان موضوعات کو جب لفظوں کا پیرہن عطا کیا ہے، انھوں نے خالص ہندوستانی الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ بہت سے خالص ہندی زبان کے الفاظ بھی، جو نثر میں استعمال ہوں تو بڑے کھردرے اور بے محل معلوم ہوں، ان کی غزلوں کے گھر آنگن میں گھل مل کر اپنی اصلی پہچان بھول گئے ہیں۔ گویا اسلم بدر نے اس طرح اپنی غزلوں کے ذریعے نئی شعری لفظیات، نئی تراکیب اور نئے شعری استعاروں کی بوطیقا تیار کی ہے۔ مول، آنگن، سمسیا، چنتن، پسارنا، دھن، سادھن، سنگم، درپن، دھرتی، آنکنا، آکاش، تھکن، کرن وغیرہ اس طرح شعری پیکر میں رچ بس گئے ہیں کہ ان کی اصلیت کی طرف ذہن مراجعت بھی نہیں کرتا۔ یہ شعر دیکھیے:

کالی اجلی چادر اوڑھے دکھ سکھ کے سپنے دیکھوں
پلکوں کے بھیگے تکیے پر جاگ لے، سو لے تو ہی تو
میں کیول کورے شبدوں کا لیکھک ہوں ان شبدوں میں
رنگ بہائے، پھول اگائے، شربت گھولے تو ہی تو

اسلم بدر کی شاعری کا جہان بڑا وسیع وبسیط ہے۔ انھوں نے صرف مشاہدۂ حق اور عرفان ووجدان کی گفتگو نہیں کی ہے، بلکہ یہاں اظہار ذات بھی ہے اور معرفت کائنات بھی۔ غم جاناں کا بھی ذکر ہے اور غم زمانہ کی آنچ بھی۔ ان کی مثنوی نگاری سے قطع نظر کر لیا جائے کہ یہ ایک موضوع کی پابند وغلام ہوتی ہے، اسلم بدر کی غزلیہ شاعری کو کسی خاص عینک سے دیکھنا ممکن نہیں۔ ان کی شاعری کا غالب وحاوی رنگ فلسفۂ وحدۃ الوجود ضرور ہے، مگر انھوں نے اسی جام جم کے ذریعے دوسرے موضوعات ومضامین کی سیر بھی کرائی ہے۔ فلسفۂ وحدۃ الوجود ان کے لیے ظلمات شب میں قائد اور رہ نما کا کام کرتا ہے، باقی مضامین کی فراوانی ان کی شاعری کو لازوال اور یادگار بناتی ہے۔ انھیں فلسفۂ وحدۃ الوجود کی پیش کش کے سبب صرف تلمیذ الرحمٰن کیوں کہا جائے، انھوں نے رومانی مضامین کو بھی لمس کی لذت عطا کیا ہے اور عشق ورومان کی ناسٹلجیائی فضا میں بھی گشت لگایا ہے۔ اسلم بدر نے معرفت ذات کے سوا زمانے کی نیرنگیوں، بوالہوسیوں، سیاسی شکست وریخت، رشتوں کے انتشار، اونچ نیچ اور ذات پات کو اپنا مرکز شاعری بنایا ہے۔

اسلم بدر ایک کہنہ مشق اور مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ کبھی دور اول میں جذباتی لب ولہجے کے شاعر شمار ہوتے تھے، مگر بعد میں ایک خاص سنجیدگی اور متانت نے خضر راہ کا کام کیا اور عشقیہ مضامین کے میکدے سے نکل کر، محویت ذات اور معرفت الٰہیہ کے در پر اپنا ماتھا ٹیک دیا۔ امید ہے کہ شاعری کی اعلیٰ قدروں کے نام منسوب بوند سمندر کی ادبی اور شعری حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

تبصرہ نگار: ابرار احمد

وایار یام فیکٹری، ضلع مدھوبنی (بہار)، موبائل: 8651708079

اردو میں منظوم ڈرامہ ۱۹۴۷ء کے بعد

مصنف: ڈاکٹر ذکی طارق
صفحات: ۲۹۶، قیمت: ۳۰۰/روپے
ناشر: ایم۔آر۔ پبلی کیشنز

ذکی طارق ناقد ومحقق سے پہلے ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کے شعری مجموعے ''احساس کی دھوپ'' (۱۹۸۳ء)، ''پلکوں پہ خواب'' (۲۰۰۳ء) اور بالخصوص ''صبح کی دہلیز'' (۲۰۱۰ء) علمی وادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ وہ نہ تو کلاسیکی روایت کے منحرف ہیں اور نہ ہی عصری حسیت سے نظریں چراتے ہیں بلکہ ان دونوں کی متوازن آمیزش سے ان کی غزلوں کا خمیر تیار ہوا ہے۔

زیر نظر تصنیف ''اردو میں منظوم ڈرامہ ۱۹۴۷ء کے بعد'' ڈاکٹر ذکی طارق کی ایک تحقیقی وتنقیدی کاوش ہے۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول ''اردو میں منظوم ڈراموں کی روایت'' کے ضمن میں انھوں نے اقبالؔ، جوشؔ، اسماعیلؔ میرٹھی، سردارؔ جعفری اور اخترؔ الایمان کی مکالماتی نظموں پر روشنی ڈالتے ہوئے مثالوں سے یہ واضح کیا ہے کہ یہ ڈرامے نہ ہوتے ہوئے بھی ڈرامائی عناصر سے لبریز ہیں اور جدید منظوم ڈرامے کی ابتدا میں ان کا اہم رول ہے۔ اس کتاب کا موضوع، آزادی کے بعد لکھے گئے منظوم ڈرامے ہیں، اس لیے وہ اردو ڈرامے کی ابتدا سے لے کر آغا حشر کاشمیری، ترقی پسند تحریک اور منظوم ڈراموں کی ترقی میں ریڈیائی ڈراموں کے کردار کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں۔ باب دوم ''منظوم ڈراموں کی قسمیں (ہیئت کے اعتبار سے)'' میں مصنف نے ہیئت کے اعتبار سے منظوم ڈراموں کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں، جن میں پہلی قسم ''تحت اللفظ ڈراما'' کی ہے۔ اس قسم کی وضاحت انھوں نے اس طرح کی ہے کہ ''جن ڈراموں کے مکالمے منظوم ہوں اور انھیں تحت اللفظ ادا کیا جائے انھیں تحت اللفظ ڈراما کہا جاسکتا ہے۔'' (ص: ۲۸) پھر انھوں نے تحت اللفظ ڈرامے کی بھی چار قسمیں بیان کی ہیں: (الف) پابند بحروں میں مکالمے؛ (ب) نظم معرا میں مکالمے؛ اور (ج) نظم آزاد میں مکالمے؛ اور (د) ان بندشوں کو توڑا بھی جاسکتا ہے اور ایسے تحت اللفظ ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں اور لکھے جاسکتے ہیں جن میں واقعہ اور موضوع کے اعتبار سے جملہ ہیئتوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ منظوم ڈرامے کی دوسری قسم ''میوزیکل ڈراما'' ہے۔ (ص: ۳۶) منظوم ڈراموں کی چوتھی قسم ''ڈانس ڈراما'' ہے، یہ ایسا ڈراما ہے جس میں الفاظ کی کم سے کم ضرورت

ہوتی ہے اور فنکار اپنے رقص، اپنے بدن کے پیچ وخم، اپنے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات سے ڈراما کو پیش کرتا ہے۔ ڈانس ڈراما کی وضاحت کے لیے مصنف نے رفعت سروش کے ڈرامے ''جہانگیر'' کو پیش کیا ہے۔

باب سوم ''چند منظوم ڈرامے اور ان کے ڈراما نگار'' کے تحت انھوں نے بالترتیب ساغر نظامی (''شکنتلا'' اور ''انارکلی'')، سلام مچھلی شہری (''زیب النساء'' اور ''میگھ دوت'')، رفعت سروش (''جہاں آرا'' اور عروج آدم'')، اختر الایمان (''سب رنگ'') اور شہاب جعفری (''یہ میری دنیا یہ میری جنت'') کے حالات زندگی اور ان کے منظوم ڈراموں کا اجمالی جائزہ لیا ہے اور پھر باب چہارم ''منظوم ڈراموں کا تنقیدی تعارف اور تفصیلی جائزہ'' میں انھوں نے باب سوم میں مذکور منظوم ڈراموں ''شکنتلا'' اور ''انارکلی'' (ساغر نظامی)، ''زیب النساء'' اور ''میگھ دوت'' (سلام مچھلی شہری)، ''جہاں آرا'' اور عروج آدم'' (رفعت سروش)، ''سب رنگ'' (اختر الایمان) اور ''یہ میری دنیا یہ میری جنت'' (شہاب جعفری) کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے منظوم ڈراموں کی فنی باریکیوں اور پیچیدگیوں کو بڑے ہی دلکش اور واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ باب چہارم ہی اس کتاب کا دل ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس باب کا مطالعہ جہاں ایک طرف اردو کے منظوم ڈراموں کی تفہیم وتشریح میں ہماری مدد کرتا ہے تو وہیں ہمیں یہ احساس بھی دلاتا ہے کہ اردو میں منظوم ڈراموں کے نمونے خال خال ہی ملتے ہیں جو اردو کا اجتماعی خسارہ ہے۔

باب پنجم اس وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں ''منظوم ڈراموں پر ہم عصر نقادوں کی آرا'' کو پیش کیا گیا ہے۔ مختلف ناقدوں اور دانشوروں کی آرا و افکار مذکورہ بالا منظوم ڈراموں کی فکری وفنی خوبیوں کو سمجھنے میں معاونت کرتی ہیں۔ اسی باب میں اختر الایمان کی تمثیلی نظم ''سب رنگ'' کے سلسلے میں ایک بیحد دلچسپ 'روداد' پیش کی گئی ہے۔

باب ششم ''اردو میں منظوم ڈراموں کی ترقی کے امکانات'' میں مصنف نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اردو منظوم ڈراموں کی پیشکش کے کامیاب تجربے وقتاً فوقتاً ضرور ہوئے ہیں، لیکن وہ تعداد میں بہت کم ہیں۔ اگر اسے آج سرکاری سرپرستی حاصل ہو اور مختلف صوبوں کی اردو اکادمیاں اور سرکاری وغیر سرکاری تہذیبی انجمنیں وادارے اس کی پیشکش میں تعاون دیں تو اس فن کے پھلنے پھولنے کے امکانات بہت واضح ہیں۔ کتاب کا آخری حصہ ''آخری تجزیہ'' دراصل پوری کتاب کا نچوڑ ہے، جسے زیر نظر تصنیف پر صاحب کتاب کا بھرپور تبصرہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ کتاب میں شامل ڈاکٹر رضیہ حامد کا ''دیباچہ'' اور ''ڈرامے کی لفظ شناسی اور ڈاکٹر ذکی طارق'' کے نام سے رشید انجم کا پیش لفظ ڈاکٹر ذکی طارق کی فکری وفنی جہات کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ کتاب کے تھیم سے مناسبت رکھنے والا دیدہ زیب سرورق، عمدہ طباعت، پروف کی خامیوں سے یکسر پاک، اس کتاب کی دیگر خصوصیات ہیں جو اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتی ہیں۔

زیر نظر تصنیف سے اردو میں نہ صرف منظوم ڈراموں کی صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس سے مصنف کی اس فن سے غایت درجہ دلچسپی اور محبت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ ان کی یہ نیک خواہشات اور امیدیں کہ ''منظوم ڈرامے تخلیق ہوتے رہیں گے، نئے نئے زاویوں کے ساتھ ترقی کا عمل جاری رہے گا۔ اردو شعر وادب کا خزانہ مالا مال ہوگا، نئے نقاد ومحقق اپنے اپنے قلم کے جوہر دکھائیں گے۔ یہی دنیا کی ریت ہے، چراغ سے چراغ جلتا رہے گا۔'' (ص: ۲۹۳) ان کے مثبت ذہن وفکر کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں۔

تبصرہ نگار: شاہنواز قمر

155، کاویری ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی، موبائل: 9599493749

شاد شناسی

مرتب وناشر: انجینئر فیروز مظفر

قیمت: ۶۰۰/روپے

پتہ: فیروز مظفر، D-40، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی۔110025

زیر تبصرہ کتاب کے مرتب انجینئر فیروز مظفر نے اس سے قبل بھی کئی کتابوں کو ترتیب دیا ہے جنھیں مقبولیت حاصل رہی ہے۔ یہ کتاب شاد عارفی کے فکر وفن کا آئینہ ہے۔ فاضل مرتب نے اپنے طویل مقدمے میں شاد عارفی کی مکمل زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ ان کا تعلیمی سفر، ان کی ازدواجی زندگی، ملازمت، ان کی شاعری، بیماری، خودداری، ان کی نفسیاتی وبشری کمزوری غرض کہ ان کے حالات زندگی اور شخصیت پر مرتب نے طویل روشنی ڈالی ہے۔ اس معلوماتی مقدمہ کی روشنی میں شاد عارفی کو بہت حد تک سمجھا جاسکتا ہے۔

اس کتاب میں کل ۳۵ مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کو شاد عارفی کے چاہنے والوں نے تحریر فرمایا ہے۔ علاوہ ازیں 'بازگشت' کے عنوان سے مشاہیر ادب کے تاثرات اور 'طناز وقت' کے عنوان سے ایک سوانحی ناولٹ کو جگہ دی گئی ہے۔ اخیر میں مرتب وناشر انجینئر فیروز مظفر نے شاد عارفی کا سوانحی اشاریہ نوٹ فرمایا ہے۔ یہ اشاریہ شاد شناسی میں ایک اہم اضافہ ہے۔

اس کتاب میں شامل مضامین خوب سے خوب تر ہیں۔ شاد عارفی کی شخصیت وفن پر مختلف مضمون نگاروں نے اظہار خیال کیا ہے۔ ان مضامین میں شاد عارفی کی شخصیت وفن سے متعلق باتیں کی گئی ہیں۔ ان مضمون نگاروں نے شاد عارفی کے فن وشخصیت، ان کی غزلوں ونظموں، ان کی شاعری میں سماجی مقصدیت، طنز، طنز کے علاوہ احتجاجی آہنگ وغیرہ وغیرہ جیسے عناصر کو موضوع بنایا ہے۔

پہلا مضمون 'ایک خود شناس شاعر' ہے، جسے پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے لکھا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''شاد فطرتاً خوددار، کم آمیز، قناعت پسند، خوشامد سے دور اور جوڑتوڑ سے نفور تھے۔ زمانے نے اس کا بدلہ ناقدری اور بے اعتنائی کی صورت میں دیا، مگر وہ ابنائے زمانہ کی ناقدری اور بے اعتنائی کو عزیز جان کر سینے سے لگائے رہے۔''

(کتاب ہٰذا، ص:۵۲)

علم میں رہے کہ پروفیسر مظفر حنفی نے شاد عارفی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ اپنے مضمون ''شاد عارفی: ایک منفرد فنکار'' میں رقمطراز ہیں:

''عام طور پر شاد عارفی کو ایک عظیم طنز نگار غزل گو کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن وہ عشقیہ غزل کے بھی اتنے ہی اہم شاعر ہیں۔ انہوں نے منظریہ، طنزیہ اور رومانی نظمیں اتنی اچھی اور کثیر تعداد میں کہی ہیں کہ تا حال تنقید یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ شاد کی غزل اور نظم میں سے کس کا پلہ بھاری ہے۔ نثر میں بھی شاد عارفی نے تنقیدی مضامین اور مکتوبات کی شکل میں قابل لحاظ ادبی سرمائے کا اضافہ کیا ہے۔''

(کتاب ہٰذا، ص:۶۳)

ایک مضمون پروفیسر محمد زماں آزردہ کا ہے، لکھتے ہیں:

''شاد عارفی کی غزلیں ان کے اپنے معاصرین کے رویوں میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مظفر حنفی نے ان کی غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے غزل کے تئیں اس تنقیدی رویے کا بھی ذکر کیا ہے جس میں غزل کو بعض اسباب کی بنا پر بچشم کم دیکھا گیا۔ ان اسباب میں سب سے اہم اس کے حیطۂ عمل کا محدود ہونا، مضامین میں تنوع کا فقدان اور حقیقی زندگی سے گریزاں ہونے کو زیادہ دخل ہے۔''

(کتاب ہٰذا، ص:۸۷۔۸۸)

یوں تو اس کتاب میں متعدد مضامین ہیں کہ جسے دانشمندوں، ادیبوں اور شاعروں نے تحریر فرمایا ہے، مگر ان سبھی مضامین کا کہ جن کا تعلق شاد عارفی کی حیات و خدمات سے ہے، ان سبھوں کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔ ہاں چند مضامین اور ان کے لکھنے والوں کا احاطہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

شاد عارفی پر ڈاکٹر محبوب راہی کے متواتر چار مضامین اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ ان چار مضامین کی اپنی الگ شناخت ہے۔ پروفیسر سلیم اختر، پروفیسر محمد نعمان خان، عروج زیدی، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، شان بھارتی، پروفیسر زینت اللہ جاوید، پروفیسر محفوظ الحسن، ڈاکٹر یحییٰ نشیط، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر فوزیہ خانم، ڈاکٹر ضیاء فاطمہ اور ڈاکٹر رؤف خیر جیسے ادبا کی تحریروں اس کتاب میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

متذکرہ مضمون نگاروں کے علاوہ بھی کئی ایسے اہم نام ہیں جن کی تحریریں پڑھنے لائق ہیں۔ ان مضمون نگاروں نے شاد عارفی کے فن و شخصیت پر مرکوز اپنی تحریروں میں شاد عارفی کے فن و شخصیت کی مختلف جہتوں کو آشکار کیا ہے۔ مشاہیر ادب کے تاثرات بھی شاد عارفی کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی، مسعود حسین، فراق گورکھ پوری، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، عبدالماجد دریابادی، وزیر آغا، محمد حسن، ظ۔ انصاری، قمر رئیس، خلیق انجم، بشیر بدر، بشر نواز، عبدالمغنی، مخمور سعیدی، گوپی چند نارنگ، گیان چند جین، احمد ندیم قاسمی، سلام مچھلی شہری، راہی معصوم رضا، صہبا لکھنوی، مظہر امام اور ندا فاضلی کے علاوہ شمیم حنفی اور شمس الرحمٰن فاروقی کی قیمتی آرا بھی شامل کی گئی ہیں۔

تبصرہ نگار: جاوید اختر
نزد پوسٹ آفس، کمھر ولی، کامتول، دربھنگہ (بہار) 847304

سید سلیمان کا ترک وطن اسباب و حقائق

مصنف: ڈاکٹر سید ارشد عالم
صفحات: ۱۵۹، قیمت: ۲۵/روپے
ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

سید ارشد اسلم کا تعلق، علامہ سید سلیمان ندوی کے خانوادے سے ہے۔ سید سلیمان ندوی ایک بہترین سیرت نگار، مشہور عالم دین، مخلص محبّ وطن اور دانشور تھے۔ ان تمام پہلوؤں کے باوجود مولانا کی نجی زندگی کے بہت سے واقعات پردۂ خفا میں تھے یا جان بوجھ کر انہیں مخفی رکھا گیا تھا۔ ایسے ہی واقعات میں سے ایک واقعہ مولانا سید سلیمان ندوی کا دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے علیٰحدگی اور ترک وطن بھی ہے۔ سید ارشد اسلم نے بڑی دلیری کے ساتھ ان حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کی ذیلی سرخیاں درج ذیل ہیں:

اس بحر کی تہہ سے نکلتا ہے کیا:	کلیم عاجز
احوال واقعی:	علیم اللہ حالی
حرف چند:	ڈاکٹر منظر حسین
پیش لفظ:	ڈاکٹر سید ارشد اسلم

اس کے علاوہ سید سلیمان ندوی کی سوانح حیات، علمی و ادبی خدمات اور ان کے ترک وطن کے سلسلے میں مختلف دانشوروں کے نظریات قلم بند کئے ہیں۔ جن میں سید شاہ معین الدین احمد، عبداللطیف اعظمی، ڈاکٹر سید محمد ہاشم، غلام محمد صاحب، ابوعلی اثر اور مولانا وحید الدین خان شامل ہیں۔ کتاب کے صفحہ ۱۱۳ پر سید سلیمان ندوی کا براہ راست انٹرویو تحریر ہے جو حفیظ الحق دسنوی نے لیا تھا۔

دراصل سید سلیمان کو دارالمصنّفین سے علیٰحدگی اختیار کرنے سے قبل دو اہم پیش کش آ چکی تھیں۔ ایک علامہ اقبال کی جانب سے سکونت لاہور کی اور دوسری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بحیثیت معلم کی۔ مولانا نے اپنے محبوب ادارے سے محبت کی بنا پر دونوں پیشکش ٹھکرا دیں، لیکن وقت کے جبر سے کون بچ سکا ہے کہ

مولانا بچ پاتے اور پھر جب اپنوں کا ہاتھ شامل حال ہو۔یہی عوامل سید سلیمان ندوی کو ادارے سے الگ کرنے کے ذمہ دار ٹھہرے۔موصوف کو ادارے سے الگ ہونے پر مجبور کرنے میں سب سے اہم نام ان کے خاص دوست مولانا مسعود ندوی کا تھا۔اس سلسلے میں ارشد اسلم لکھتے ہیں:

''معاملہ یہ ہے کہ ان کے ایک دوست و رفیق (مولانا مسعود ندوی) کے درمیان یہ ''حریف خیر خواہی'' اصلاح ذات البین کا ساعی ہے۔''

دراصل تقسیم ہند سے جہاں ایک طرف سیاسی، سماجی اور عوامی انتشار کا ظہور ہوا وہیں دوسری طرف کئی سارے ادیب بھی بٹوارے کا حصہ بنے۔سید سلیمان ندوی گو اس وقت تو یہیں ٹھہرے، لیکن ۱۹۵۰ء میں انہیں اپنی بیمار نواسی کی عیادت کے لیے پاکستان جانا پڑا۔اس سے قبل سلیمان ندوی نے جس ادارے (دارالمصنّفین) کو اپنے خون جگر سے سینچا تھا اسے کچھ دوستوں اور شاگردوں کے کرم کی بنا پر خیر باد کہہ دیا تھا۔مولانا پاکستان سے واپس لوٹنا چاہتے تھے، لیکن جس سرد مہری کا یہاں کی سرکار اور خصوصاً دارالمصنّفین کی عاملہ نے اظہار کیا اس سے مولانا دل برداشتہ ہو گئے۔حالانکہ مولانا کے پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد سے اچھے دوستانہ مراسم تھے، لیکن ان دونوں احباب تک یہ بات پہنچائی نہیں گئی اور یوں وہ شخص جس نے ایک لمبے عرصے تک اس ملک اور ادارے کی آبیاری کی، دیار غیر ہی میں سپرد خاک ہوا۔حق مغفرت کرے۔

ایسے اور بھی بہت سے حقائق ہیں جنھیں ارشد اسلم نے اس کتاب میں بیان کیا ہے۔حق گوئی اور بے باکی اس کتاب کی اہم خصوصیت ہے۔فاضل مصنف نے ان تمام خطوط اور اقتباسات جو سید سلیمان ندوی کی تحریروں میں شامل نہیں یا حذف کر دیے ہیں کا اس کتاب میں ذکر کیا ہے۔مختصر یہ کہ یہ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اور سید سلیمان ندوی کی زندگی کے کئی گوشوں کو وا کرتی ہے۔قاری کے اندر تجسس کا ایک نیا سماں باندھتی ہے۔

تبصرہ نگار: مسعود احمد

کمرہ نمبر 71، تاپتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی۔110067

مکتبِ سخن (عروضی نکات پر مبنی)

مرتب: دردد ہلوی

صفحات: ۲۷۲، قیمت: ۱۶۸/روپے

ناشر: 756، گلی نمبر 26، جعفر آباد، دہلی۔110053

دہلی کے ادبی حلقے میں دردد ہلوی ایک معتبر نام ہے۔موصوف کی کاوشوں کا سلسلہ صرف شعر و شاعری تک ہی محدود نہیں بلکہ اردو کے فروغ اور اس کے ارتقا کے لیے وہ مختلف موضوعات کو لے کر سرگرم عمل رہتے ہیں۔مشاعرے اور شعری نشستیں برپا کرنے کے علاوہ کئی شعری و نثری مجموعے بھی منظر عام پر آ کر تشنگان ادب کو سیراب کرنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

ان کے علاوہ دردد ہلوی نے فنِ عروض پر بھی بہت کام کیا ہے حالانکہ اس موضوع پر بازار میں بہت سی کتابیں دستیاب ہیں تاہم دردد صاحب نے جس طرح سہل انداز میں ''مکتبِ سخن'' کو مرتب کیا ہے۔اس کے لیے یقیناً وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔بہت ہی آسان طریقے سے ارد و اشعار کی تقطیع کر کے نئی نسل کے شعرا کی انھوں نے بہترین رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں انھوں نے فن کی معتبر کتابوں سے صرف اہم عروضی پہلوؤں کو پیش کیا ہے، بطور خاص مترنم بحروں پر توجہ دی ہے۔موجودہ دور میں شعراء کرام ان بحروں کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔کتاب کے پہلے باب میں جو عناوین ہیں ان سے کتاب کی اہمیت اور انفرادیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر: شعر کی تعریف، تخیل، الفاظ کی جستجو، آمد اور آورد میں فرق، شعر میں کیا کیا خوبی ہونی چاہیے، سادگی سے کیا مراد ہے، جھوٹ اور مبالغے سے بچنا چاہیے، نیچرل شاعری، استعارہ، کنایہ، تمثیل کی تعریف وغیرہ کے ساتھ بحر، تقطیع کرنے کا طریقہ، محاسنِ کلام اور عیوب کلام، ان کے ذیلی عناوین ہیں، جنھیں دردد ہلوی نے انتہائی سہل انداز میں سمجھایا ہے، جس سے شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والے عام قارئین بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔

''مکتبِ سخن'' کا دوسرا حصہ ''رہنمائے قوافی'' پر مشتمل ہے، قافیے کے بغیر شاعری کو نامکمل تصور کیا جاتا ہے۔قافیوں کی تلاش میں کبھی کبھی شاعر کو کافی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات تو آسان سا قافیہ بھی ذہن میں نہیں آتا، دردد صاحب نے اس حصے میں تقریباً ساڑھے چار ہزار قافیوں کو ترتیب کے ساتھ جمع کیا ہے۔مثلاً شاعر نے ''کتاب'' کا قافیہ باندھا ہے تو اسے اس کے ذیل میں آنے والے کافی قافیے ترتیب سے ایک جگہ دستیاب ہو جائیں گے۔نیز عام قافیوں کے علاوہ ہر قافیے کے معنی، تذکیر و تانیث اور اس کی زبان کو بھی درج کیا ہے جس کی وجہ سے کتاب نے لغت کی شکل اختیار کر لی ہے، تاہم فن کی مناسبت سے یہ ضروری تھا۔قافیوں کو یکجا کرنے کے علاوہ قافیوں میں وارد ہونے والے عیوب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔جناب شہادت علی نظامی نے درست فرمایا کہ: ''مکتبِ سخن ایک ایسی کتاب ہے جس کی ادبی دنیا میں ایک مدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔''

کتاب مجموعی حیثیت سے تمام شعری موضوعات سے متعلق اہمیت کی حامل ہے۔

تبصرہ نگار: شعیب دانش

علی اپارٹمنٹ، گلی نمبر 4، نزد تقویٰ مسجد، جوگا بائی ایکسٹینشن، اوکھلا، نئی دہلی

◆◆◆